 

15-10-2016

متفرقات

مفتی منیب الرحمٰن

بڑا جسم چھوٹا دماغ:

ایک کالم میں بھارتی مسلح افواج پر دی اکانومسٹ یا کسی مغربی اخبار کا یہ تبصرہ نظر سے گزرا: ''بھارتی افواج کی مثال ہے: بڑا جسم اور چھوٹا دماغ''۔ یعنی اس کا سائز اور حجم تو یقیناً بڑا ہے، کیونکہ افواج کے سائز کا مدار جوانوں اور افسروں کی تعداد، ہر قسم کے اسلحے کی مقدار اور دستیاب وسائل پر ہوتا ہے۔ ان تمام شعبہ جات میں بھارتی افواج پاکستانی افواج سے کئی گنا زائد ہیں، رقبے کی وسعت کی بناء پر بھارت میں ہر جہت سے گہرائی اور گیرائی بھی زیادہ ہے۔

اس کے برعکس ''دماغ چھوٹا'' ہونے کا جو استعارہ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جنگی ہتھیار قابلِ استعمال حالت میں نہیں ہیں، فرسودہ ہیں، ان کی دیکھ بھال اور مرمت ٹھیک طور پر نہیں کی جاتی۔ فوج کا ایک بڑا حصہ ملک کے مختلف حصوں میں آزادی کی تحریکوں کو کچلنے میں مصروفِ عمل ہیں، جو ایک اکتا دینے والا عمل ہے۔ اسلحہ حریت پسندوں اور باغیوں کے ہاتھ فروخت ہونے کی بھی اطلاعات ہیں، جو فوج میں کرپشن کی علامت ہے اور بھارتی فوج کے جذبے پر بھی سوالیہ نشان ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ دنیا میں آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر، رقبے کے لحاظ سے ساتویں نمبر پر اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے دعوے دار ملک بھارت کی سیاسی قیادت نہایت پست ذہنی سطح کی حامل ہے۔ ملک کے دستور کی اساس جن اصولوں پر قائم ہے، اُن میں سیکولرازم سرِ فہرست ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملے میں فریق نہیں ہے اور کسی خاص مذہب کی سرپرستی اُس کے منشور میں شامل نہیں ہے۔

لیکن ملک کے وزیرِ اعظم کی شہرت ایک شدت پسند مذہبی نظریات کے حامل قوم پرست کی ہے، حالانکہ ملک میں مذہبی، لسانی اور نسلی اعتبار سے تکثُّر اور تعدُّد (Plurality) ہے۔ ایک جانب بھارت اُسے اپنا افتخار قرار دیتا ہے اور دوسری جانب مذہب کی بنیاد پر نفرت اور شدت پسندی کا علمبردار ہے اور اُس کا وزیرِ اعظم اس ساری فکری تحریک کا سرخیل ہے۔ مُلک میں خالصتان، تامل ناوٗ، ناگالینڈ، تری پورہ اور منی پور کی صورت میں علیحدگی کی تحریکیں جاری ہیں اور مقبوضہ جموں وکشمیر کے حقِ حُریّت کو تو اقوامِ متحدہ نے بھی تسلیم کر رکھا ہے۔ نریندر سنگھ مودی نے ہندو انتہا پسند تنظیموں راشٹریہ سیوک سنگھ، وشوا ہندو پریشد، سنگھ پریوار اور اُن کی ذیلی تنظیموں کی مدد سے 2014 کا الیکشن جیتا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا پہلا جنم انتہا پسند ہندو نوجوانوں کی تنظیم ''جَن سنگھ'' کے نام پر ہوا تھا۔ پاکستان میں مذہبی عسکریت تو امریکہ اور اہلِ مغرب کا مَن پسند موضوع ہے، لیکن ہندوستان میں حکومتی سرپرستی میں اُس کی حامی شدت پسند ہندو تنظیموں کی برپا کردہ نفرت انگیزی اور فرقہ وارانہ تصادم سے وہ آنکھیں بند رکھتے ہیں، کیونکہ اُن کے لیے ہندوستان کی سوا ارب کی مارکیٹ نہایت پُرکشش ہے اور ہندوستان کو

چین کے مقابل ایک متوازی فوجی قوت کے طور پر کھڑا کرنا اُن کا ترجیحی ہدف ہے۔ مگر حالیہ سارک کانفرنس کے اِلتواء سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ موجودہ بھارت ''ہندو توا'' کے استعماری نظریے کا عَلَم بردار ہے اور وہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ باہمی احترام کی بنیاد پر چلنے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔

امریکی صدارتی انتخابات:

امریکی ہمیشہ فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم ایک سیکولر ملک ہیں اور ہمارے آئین کی دوسری ترمیم یہ ہے: ''کانگریس کسی خاص مذہب کو استحکام دینے کے لیے کوئی قانون سازی نہیں کرے گی''۔ نائن الیون کے بعد مغرب میں ''اسلاموفوبیا'' کی اصطلاح وجود میں آئی ،لیکن حالیہ صدارتی انتخاب کی مہم نے دنیا کو حیرت زدہ کردیا، یہ تو 8 نومبر کو معلوم ہوگا کہ امریکی کسے اپنا صدر منتخب کرتے ہیں۔ لیکن ڈونلڈ ٹرمپ کی صورت میں ایک اَوسَط ذہنیت کے شخص کا تمام انتخابی مراحل سے گزرتے ہوئے کانگریس کے دونوں ایوانوں میں اکثریت کی حامل ریپبلکن پارٹی کا باقاعدہ صدارتی امیدوار بن جانا، پوری دنیا کے لیے حیرت کا باعث ہے۔ کیونکہ ڈونلڈ ٹرمپ نے روزِ اول سے مسلمانوں ،اسپینش باشندوں، سیاہ فام امریکیوں اور تارکینِ وطن کے خلاف اپنے بغض اور نفرت کو ایک لمحے کے لیے بھی چھپایا نہیں ہے۔ یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ ریپبلکن پارٹی امریکہ میں دائیں بازو کے سرمایہ داروں اور کارپوریٹ اجارہ داروں کے مفادات کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ مالی طور پر کمزور طبقات کے لیے ہیلتھ کیئر اور فوڈ اسٹیمپ پروگرام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور ٹیکس میں کمی کی بات کرتے ہیں اور یہی چیز بڑے سرمایہ داروں کے لیے پرکشش ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ صدر منتخب ہوں یا نہ ہوں، ہر صورت میں دنیا کو اُن کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ امریکی سفید فام طبقات اور اُمراء کے دلوں میں معاشی اعتبار سے نچلے طبقات کے لیے جو انتہا درجے کی نفرت مستور تھی ،انہوں نے اُس پر سے پردہ اٹھا دیا ہے اور آنے والے زمانے میں امریکہ کا دامن تارکینِ وطن اور مسلمانوں کے لیے سمٹتا چلا جائے گا۔ پس اہلِ مغرب کے ذہن بھی اب دوسروں کے لیے نفرت کی آماجگاہ بن چکے ہیں اور تنگ ہوتے جارہے ہیں۔ جرمن چانسلر انجیلا مرکل نے شامی پناہ گزینوں کی ایک معتد بہ تعداد کو اپنے ملک میں قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو وہاں کی قوم پرست جماعت نے انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا، اُس کے بعد وہ بعض مقامی اور صوبائی انتخابات ہار چکی ہیں۔ سو یہ صورتِ حال بھی خطرے کی گھنٹی ہے، اسی طرح برطانیہ، فرانس اور دیگر یورپین ممالک میں بھی نیشنلسٹ جماعتیں پہلے سے زیادہ مقبولیت حاصل کررہی ہیں، الغرض مغرب دنیا کی قیادت کا اخلاقی جواز کھو چکا ہے۔ اہلِ مغرب اپنے ذہنوں میں موجود نفرت کے الاؤ کو جمہوریت اور اظہارِ رائے کی آزادی کے پردوں میں چھپائے رکھتے ہیں، جب کہ ہماری بعض کمزوریوں کو دس تہوں سے بھی باہر نکال کر ہمیں بلیک میل کرتے ہیں اور ہمیشہ دفاعی پوزیشن میں رکھتے ہیں، کیونکہ ہم خود اپنی پیدا کردہ کمزوریوں کے باعث مکالمے میں جارحانہ پوزیشن اختیار نہیں کرپاتے۔

جناب یوسف سراج کی خدمت میں:

" اَھلُ السُّنَّة والجماعة کون؟ '' کے عنوان سے روزنامہ دنیا کے ادارتی صفحات پر یکم اکتوبر 2016ء کو میرا کالم چھپا۔ اس پر حافظ یوسف سراج صاحب کا بہ انداز استہزاء ردعمل پڑھ کر حیرت ہوئی، یہ کسی صاحب علم کا انداز نہیں ہوتا، بہرحال یہ شِعار اُن کو مبارک ہو، علامہ اقبال نے کہا ہے:

اے اہلِ نظر !ذوق نظر خوب ہے، لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے ، وہ نظر کیا

میں نے گروزنی کانفرنس کے بارے میں سنا تو اُس وقت تک اس پر کچھ نہیں لکھا، جب تک کہ مجھے ثقہ ذرائع سے اس کا متن دستیاب نہیں ہوا، میرا مزاج اندھیرے میں تیر چلانا نہیں ہے۔ یہ آرٹیکل میں نے کسی مسلکی جریدے میں نہیں لکھا، بلکہ ایک مؤقر قومی روزنامے میں لکھا ہے اور اس کا مقصد اہلِ علم اور خاص طور پر اپنے ملک کے دینی طبقات کو حالاتِ حاضرہ کے بارے میں آگہی دینا تھا۔ میں نے نہایت دیانت داری سے یہ بھی لکھا کہ یقیناً شام کے حالات کے تناظر میں اِسے روس اور ایران کی آشیر باد بھی حاصل ہو گی اور اہلِ تشیُّع کی ویب سائٹس نے اس کی خوب تشہیر بھی کی، لیکن چیچنیا کی اِس پیش رفت کا اصل محرِّک اُن کے اپنے داخلی مسائل ہیں، کیونکہ وہاں عسکریت پسند یا خارجی تکفیری تحریکیں زیرِ زمیں موجود ہیں۔ اس کانفرنس میں پاکستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا کہ اسے یہاں کے مسلکی خلافیات کا شاخسانہ قرار دیا جائے، بلکہ اس میں شیخ الازہر سمیت عالَمِ عرب کے نمائندے شامل تھے۔ حافظ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ چند سال پہلے الجامعۃ الازہر میں ''التوسُّط بینَ الْغُلُوِّ وَالتَّطَرُّف، تحتَ فِکرِ امام ابی الحسن الاشعری ''کے عنوان سے ایک عالمی کانفرنس منعقد ہو چکی ہے، سو فسادی عناصر نے عالمی سطح پر امتِ مسلمہ کو دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سعودی علماء نے اس کانفرنس کا نوٹس لیا اور انہیں اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنی پڑی، اگر یہ مسئلہ ایک مزاحیہ کالم کی مار ہوتا تو یقیناً وہ آپ کی مدد لیتے اور مورچہ فتح کر لیتے، لیکن ناگواری کے باوجود بعض حقائق کا سامنا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میں نے اُن کا موقف بھی بیان کیا اور اُس پر ڈاکٹر عبداللطیف سعید فودہ نے جو وضاحتی بیان جاری کیا، اُسے بھی بیان کر دیا ہے۔ عام قارئین کی آگہی کے لیے میں نے چند اصطلاحات کی وضاحت کی اور اُس میں، میں نے اپنی سوچ شامل نہیں کی۔ حافظ صاحب نے یہ تاثر دیا کہ جیسے کسی کو ''اہلُ السنّہ و الجماعہ'' میں داخل یا خارج کرنے کے لیے میرے ایما پر یہ کانفرنس منعقد ہوئی ہو۔

المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں سوچنے کا انداز محدود ہے اور ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ پتھر ہماری طرف ہی پھینکا گیا ہے۔ حضور والا! یہ مسئلہ عالمی فورم پر اٹھایا گیا ہے اور اس کا تناظر بھی عالمی ہے اور خاص طور پر شام اور خود چیچنیا کے حالات کے زیرِ اثر ہے۔ داعش تو بہت پہلے ابوبکر البغدادی کی قیادت میں قائم ہو چکی تھی، لیکن کافی عرصے سے یہ زیرِ زمیں چلی آ رہی تھی۔ جب اُس نے ایک خطے پر قبضہ کر کے اپنا اقتدار قائم کیا اور اُن کا فساد کھل کر دنیا کے سامنے آیا، تو ناگزیر طور پر سعودی عرب کے علماء کو انہیں خارجی اور تکفیری قرار دے کر ان سے براءت کا اعلان کرنا پڑا، کیونکہ اب یہ بلا اُن کی سرحدوں کے قریب پہنچ چکی ہے اور اس کی تپش انہیں قریب تر محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں کے اہلِ حدیث علماء کی بھی خروج اور بغاوت پر کتابیں سامنے آ چکی ہیں اور توحید کی اقسام (توحیدِ ربوبیت، توحیدِ الوہیت اور توحیدِ اسماء وصفات) پر توحیدِ حاکمیت کا اضافہ بھی سلفی مکتبِ فکر کے لیے ایک چیلنج کے طور پر سامنے آیا ہے۔ میرا کالم پڑھ کر وفاق المدارس السلفیہ کے ناظمِ اعلیٰ مولانا یاسین ظفر نے بہ حیثیتِ مجموعی اس کی تحسین کی اور کہا کہ ہمارے حوالے سے یہ جملہ ڈال دیا ہوتا: ''آج کل کے سلفی، تکفیری اور خارجی نظریات سے برملا براءت کا اعلان کرتے ہیں''۔ مسلکی خلافیات اور کلامی مسائل میں نے اختراع نہیں کیے، یہ پہلے سے چلے آ رہے ہیں اور نہ ہی میں نے مذکورہ کالم میں براہِ راست انہیں اپنا موضوع بنایا ہے۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ ہمارے اہلِ علم کو عالمی سطح پر ان حرکیات کے بارے میں آگہی حاصل ہو۔ البتہ مجھ سے یہ ریمارکس دینے کا ''جرم'' ضرور سرزد ہوا ہے کہ سعودی عرب کے علماء کو امت کی مشکلات کے عالمی تناظر کا ادراک کرتے ہوئے توسُّع اختیار کرنی چاہیے اور امتِ مسلمہ کے تمام مکاتبِ فکر کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر مثبت رابطے کے لیے کوئی حکمتِ عملی اختیار کرنی چاہیے، کیونکہ یہ دورِ حاضر کی ناگزیر ضرورت ہے۔

(روزنامہ دنیا، 15 اکتوبر 2016ء)